ترجمہ وتلخیص: فدا محمد عدیل (دوسری قسط)

گوانتاناموبے میں کیا قیامت ڈھائی جارہی ہے؟

پاکستان میں طالبان کے آخری سفیر ملا عبدالسلام ضعیف
امریکی عقوبت خانے میں گزرے لہورنگ شب وروز کی دل گداز روداد بیان کررہے ہیں

امریکیوں کو حوالگی:

''خدا حافظ'' کے الفاظ سننے کے بعد میں نے کچھ لوگوں کی آوازیں سنیں جو انگریزی میں باتیں کررہے تھے۔ پھر اچانک وہ لوگ ریچھوں کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوگئے اور مجھ پر لاتوں، گھونسوں اور مکوں کی بارش کرنے لگے۔ یہ سب اتنا اچانک تھا کہ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا۔ میرے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کی گئی، کبھی اوندھے منہ لٹا دیا جاتا، کبھی کھڑا کرکے دھکا دے دیا جاتا، میرے کپڑے چاقوؤں کی مدد سے پھاڑ دیئے گئے۔ اس دوران میری آنکھوں پر بندھی پٹی اتر گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک طرف پاکستانی فوجی قطار بنائے کھڑے تھے جبکہ ساتھ ہی آفیسرز کی گاڑیاں تھیں جن میں ایک پر جھنڈا لگا ہوا تھا۔ امریکیوں نے مجھے مارا پیٹا اور بے لباس کردیا مگر اسلام کے یہ محافظ ''میرے سابقہ دوست'' تماشا دیکھتے رہے۔ ان کے لبوں پر لگے تالے میرے لیے ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے میری حوالگی کے سارے تقاضے پورے کررکھے تھے۔ یہ وہ لمحات تھے جن کو میں قبر میں بھی نہ بھول سکوں گا۔ میں کوئی قاتل، چور، ڈاکو یا قانون کا مجرم نہیں تھا۔ مجھے بغیر کسی جرم کے امریکہ کے حوالے کیا جارہا تھا۔ وہاں موجود آفیسرز کم از کم اتنا تو کہہ سکتے تھے کہ یہ ہمارے مہمان ہیں، ہماری موجودگی میں ان کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جائے۔ وحشی، متعصب اور بے رحم امریکی فوجیوں نے ایسی حالت میں مجھے زمین پر پٹخ دیا کہ میرا جسم ننگا تھا۔ پھر مجھے ہیلی کاپٹر میں دھکیلا جہاں میرے ہاتھ پاؤں زنجیروں سے کس کے باندھ دیئے گئے اور آنکھوں پر پٹی بھی دوبارہ باندھی گئی۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا۔ میرے چہرے کو سیاہ تھیلے سے بھی ڈھانپ دیا۔ پھر میرے اردگرد سے پاؤں تک رسی باندھی اور ہیلی کاپٹر کے وسط میں زنجیر سے باندھ دیا۔ ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوگیا۔ میں جب حرکت کی کوشش کرتا تو زوردار لات پڑتی۔ مجھے لگا کہ آنے والے چند لمحوں میں میری روح اور جسم کا رشتہ ختم ہونے والا ہے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ میں کتنی دیر تک اس کرب میں مبتلا رہا۔ آخر کار ہیلی کاپٹر ایک جگہ اترا۔ وحشی امریکی درندوں نے ہیلی کاپٹر سے گھسیٹتے ہوئے مجھے نیچے پھینک دیا۔ جس کے ساتھ ہی وہاں پہلے سے موجود دوسرے امریکی بھی مجھ پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگے اور میرا وہ حال کیا جو بیان سے باہر ہے۔ الٹا لٹا کر میرے اوپر چار پانچ افراد بیٹھ گئے اور ایسی باتیں کرنے لگے جیسے کسی اجلاس میں بیٹھے ہوں۔ میری سانس نہیں نکل رہی تھی، بے اختیار دل ہی دل حضرت عزرائیل کو پکار رہا تھا کہ اے عزرائیل کہاں ہو؟

مجھے اس جگہ دو گھنٹے اسی کرب میں رکھا گیا پھر دوسرے ہیلی کاپٹر میں سوار کرا کر ایک آہنی کرسی سے باندھ

دیا گیا۔اب کی بار مجھے مارنہیں پڑ رہی تھی ۔۲۰/ ۲۵ منٹ بعد ہیلی کاپٹر نیچے اترا ۔ مجھے اندر ہی کھڑا کیا گیا ۔ یہاں متعدد جہازوں کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں ۔ مجھے نیچے اتار کر چہرے سے نقاب ہٹا دیا گیا اور آنکھوں کی پٹی بھی اتار دی گئی ۔ دیکھا کہ چند امریکی فوجی کھڑے ہیں ۔ بائیں جانب ایک قید خانہ نظر آیا جس میں چند قیدیوں کو باندھا گیا تھا ۔اسی جگہ مجھے بھی ڈال دیا گیا ۔ یہاں موجود ایک چھوٹے سے واش روم میں مجھے منہ ہاتھ دھونے کو کہا گیا مگر میرے ہاتھوں میں سکت نہیں تھا ۔ میں نے اتنا کیا کہ خود کو گیلا کر دیا پھر مجھے ایک چادر دے کر ایسے کمرے میں لے جایا گیا جو دو میٹر لمبا اور ایک میٹر اونچا تھا ۔رفع حاجت کی جگہ بھی اتنی سی جگہ میں تھی ۔ کمرے کی دیواریں آہنی تھیں ۔اوپر سے مضبوط آہنی جالیاں بھی لگائی گئی تھیں ۔ مجھے سونے کے لے کہا گیا مگر نہ بستر تھا نہ تکیہ ۔ حیران تھا کہ میں کہاں لا گیا گیا ہوں اور مزید کس سلوک کا سامنا کرنا پڑے گا ؟

میری بائیں جانب ایک بڑا کمرہ تھا جس میں بھی مجاہدین کو رکھا گیا تھا ۔ان کو بھی میری گرفتاری کا پتا چل گیا ۔ہم ایک دوسرے کو صرف دیکھ سکتے تھے ، باتیں کرنے کی اجازت نہ تھی ۔ دیکھنے کا موقع بھی تب ملتا تھا جب کھانا تقسیم ہوتا تھا ۔ چند دن یہاں رہنے کے بعد پتا چلا کہ ملا فاضل محمد ،نور اللہ نوری ، برہان رفیق اور غلام روغانی بھی یہاں ہیں ۔ یہ طالبان مجاہدوں کے رہنماؤں میں سے تھے ۔ ہمارے مابین بات چیت نہ ہوتی تھی ۔ایک دن مجھے ہتھکڑی پہنا کر ایک دوسرے کمرے لے جایا گیا جہاں تفتیش کا پہلا مرحلہ شروع ہونا تھا ۔ میری انگلیوں کے نشانات لیے گئے ،فوٹو گرافی ہوئی اور بائیو گرافی لکھی گئی ۔اس کے علاوہ کوئی سوال جواب کیے بغیر واپس اسی قید خانے میں لایا گیا جہاں رات کا کھانا پلاسٹک کے برتنوں میں پڑا ملا ۔ ہلکا پھلکا کھانے کے بعد برتن فوجیوں کو واپس کر دیئے جس کے بعد سونے کا ارادہ باندھا ۔ابھی آنکھیں بند ہی ہو رہی تھیں کہ فوجیوں کے شور سے جاگ گیا ۔ مجھے پکڑ کر دوبارہ تفتیش والے کمرے میں لے جایا گیا' جہاں پہلی دفعہ مجھ سے اسامہ بن لادن اور ملا عمر کے بارے میں سوالات پوچھے گئے اور نائن الیون کے بارے میں پوچھا گیا ۔ میرے سارے جوابات نفی میں تھے' جس سے شاید ان کو پتا چل گیا کہ میرے پاس مطلوبہ معلومات نہیں ہیں ۔ یہ وہ سوالات تھے جن کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہزاروں بے گناہ افغان شہریوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ۔ دہشت گردی وہ ''مکا'' ہے جسے امریکہ کسی بھی وقت کسی کے منہ پر بھی مار سکتا ہے ۔اسی دہشت گردی کے نام پر افغانستان اور عراق پر قبضہ جمایا گیا ۔

سوال جواب کا یہ سلسلہ پانچ دن تک مسلسل جاری رہا ۔ میرے لیے اچھی بات یہ تھی کہ مار پیٹ نہ تھی ۔ پھر ہمیں باگرام لے جانے کے لیے یونیفارم دیا گیا ۔ میرے اور دوسرے ساتھیوں کے یونیفارم میں فرق تھا ۔ مجھے خاکی ان کو آسمانی رنگ کا یونیفارم دیا گیا ۔ ہمارے ہاتھ اور پاؤں پلاسٹک کی رسیوں سے باندھے گئے ،سر کو سفید پلاسٹک کے لفافے میں ڈھانپ کر گلے کے نزدیک لفافے کا منہ باندھ دیا گیا' جس سے دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا ۔ہم سب کو ایک جگہ اکٹھا کیا گیا ۔ ہمارے ساتھیوں میں ایک عرب اور ایک امریکی مسلمان بھی تھا ۔ میں نواں قیدی تھا ۔ میں نے پانی مانگا مگر نہیں دیا گیا ،تھیلا بھی نہیں ہٹایا گیا ۔صرف ہیلی کاپٹرز کی آوازیں اور امریکیوں کا شور سنائی دے رہا تھا جو بار بار SHUT UP اور DONT MOVE کہتے رہے ۔ یہ سلسلہ تین گھنٹے جاری رہا پھر ہیلی کاپٹر میں چڑھا کر دوسری جگہ منتقل کیا گیا ۔تقریباً ۲۵ منٹ بعد ہیلی کاپٹر اترا اور ہمیں نیچے پھینکا گیا ۔ یہاں بھی نئے فوجیوں نے ہم پر یلغار کر دی ،کبھی لاتوں سے مارتے تھے ،کبھی ہمارے جسموں

پر چھلانگیں لگاتے تھے۔ ہمارے ہاتھ پیچھے باندھے گئے تھے۔ ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں بوٹوں سے مسلتے تھے۔ ایک امریکی جنرل نے میری شکل دیکھنا چاہی، میرے چہرے پر سے تھیلا ہٹایا گیا، جنرل نے دیکھا اور کوئی بات کہے بغیر دوبارہ ڈھانپنے کا اشارہ کیا۔ یہاں تین گھنٹے انتظار کرایا گیا۔ پانی دیا گیا، نہ نماز پڑھنے دی گئی۔ ہم سب نے اشاروں سے نماز پڑھی۔ اس دوران ضربیں دی جاتی رہیں۔ رات کو ایک جہاز آیا جس میں ہم نو افراد کو چڑھایا گیا۔ جہاز کا یہ سفر اب بھی یاد آئے تو کانپنے لگتا ہوں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ پل صراط تھا اور نزع کی حالت تھی۔ جہاز میں میرے پاؤں اور سینے کو کس کے باندھا گیا اور ایسی حالت میں سب کو رکھا گیا کہ نہ بیٹھ سکتے تھے اور نہ لیٹ سکتے تھے۔ کمر کے درد سے ہماری چیخیں نکل رہی تھیں مگر سوائے صبر کے کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی کمر کو ٹیک لگاتے تو زوردار لاتیں پڑتیں تھیں۔ ہم خود کوئی بات کر سکتے تھے اور نہ کوئی ترجمان تھا۔ یہ بہت تکلیف دہ لمحات تھے۔ راستے میں دو مرتبہ جہاز اڑا، پھر اترا، بہت دیر بعد جہاز اترا۔ یہ بگرام ائیر پورٹ تھا۔

فوجیوں نے میری رسیاں کھولیں اور رن وے پر انتہائی بے دردی سے پھینکا۔ فوجی THIS IS THE BIG ONE کہہ کہہ کر مجھ پر حملہ آور ہو جاتے اور لاتوں، گھونسوں اور مکوں کی بارش کر دیتے۔ اس سے بھی ان کا غصہ کم نہیں ہوا، پھر مجھے بندوقوں کے بٹ مارے گئے۔ میرا جسم ننگا ہو گیا تھا مگر چہرے پر وہی تھیلا، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ اسی حالت میں مجھے برف پر پھینکا گیا۔ بگرام میں اس دن تازہ برفباری ہوئی تھی۔ مجھ پر تشدد کے دوران وہاں موجود امریکی عورتوں اور مرد فوجیوں نے گانا شروع کر دیا۔ ان کے جو شعر مجھے سمجھ آ رہے تھے، وہ یہ تھے:

''امریکہ عدل وانصاف کا گھر ہے
عدل وانصاف کا طرف دار ہے
اور ہر کسی کے لیے انصاف چاہتا ہے''

ہمارے ساتھ ہونے والا وحشیانہ سلوک امریکیوں کو انصاف لگ رہا تھا۔ سخت سردی سے میرا جسم کانپ رہا تھا۔ بار بار کہا جاتا "STOP MOVEMENT" مگر کپکپی روکنا میرے بس میں کہاں تھا۔ اس ظلم اور ناروا سلوک کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گیا۔ بعد میں کسی چیز کا پتا نہیں چلا۔ ہوش میں آیا تو بڑے کمرے میں پڑا تھا۔ نو دس بجے دن کا وقت تھا، سارے بدن میں درد تھا، جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ چھے فوجیوں نے میرے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا جن میں دو نے چہرے چھپا رکھے تھے اور ہاتھوں

افغانستان کی مٹی

بگرام میں امریکیوں کی قید کے دوران قطر سے تعلق رکھنے والے ایک مجاہد سالم نے جو واقعہ نم آنکھوں سے سنایا، وہ میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ سالم نے بتایا: ''افغانستان میں طالبان پر آزمائش آ پڑی تو کوئی مجھے، میری بیوی اور ننھی بچوں کو پناہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہم بمباری سے کبھی یہاں بھاگتے تھے، کبھی وہاں۔ ایک دن ہماری معصوم بچی جس نے ابھی ابھی بولنا شروع کیا تھا، اپنی توتلی زبان میں سردی کی شکایت کی۔ میں اور میری بیوی نے بے بسی سے رونا شروع کر دیا کیونکہ ہم اپنی بچی کو سردی سے بچانے کے لیے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ میں نے خدا خدا کر کے بیوی اور بچی کو چمن پہنچایا۔ ہمارے ساتھ کچھ دیگر عربی خواتین بھی تھیں۔ ہم جب افغان سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہونے لگے تو خواتین نے افغانستان کی مٹی اپنے دوپٹوں کے ساتھ باندھنا شروع کر دی۔ میں نے پوچھا: ''یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' جواب ملا: ''معلوم نہیں پھر کبھی افغانستان کی سرزمین دیکھنا نصیب ہو گی یا نہیں؟ افغانستان کی مقدس مٹی جہاد کی مٹی ہے اور واحد ملک ہے جہاں اللہ کے دین کا نفاذ ہوا۔'' سالم اپنے بچوں کے احوال سے لاعلم تھا اور بار بار پوچھتا کہ معلوم نہیں پاکستانیوں نے میری بیوی اور بچی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا؟

میں ڈنڈے اٹھائے ہوئے تھے۔ دو دوسرے کالے رنگ کے فوجیوں نے میرے سر پر پستول تان رکھے تھے جبکہ سامنے دو اور فوجیوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ ہر فوجی نے چیخ کر باری باری پوچھا، بتاؤ اسامہ کہاں ہے؟ ملا عمر کہاں چھپا ہوا ہے؟ تم نے نیویارک اور واشنگٹن میں کیا کیا؟ میں چھے بندوں میں ننگا پڑا تھا۔ کیا انصاف ہے امریکہ کا؟

درد اور تکلیف سے میری آواز نہیں نکل رہی تھی، دانتوں اور زبان میں درد تھا۔ یہ ایسا لمحہ تھا کہ میں مرنا چاہتا تھا مگر میری یہ خواہش بھی پوری نہ ہو رہی تھی۔ جب ان کو پتا چلا کہ میں بات نہیں کر سکتا اور ان کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتا تو انہوں نے کچھ دیر کے لیے مجھے چھوڑ دیا۔ مجھے ایک سبز چادر میں لپیٹا اور ایک ٹھنڈے کمرے میں ڈال دیا۔ میری حالت انتہائی خراب تھی۔ صرف ایک چادر کے علاوہ میرے جسم پر کچھ بھی نہ تھا۔ درد کے بارے میں پھر بے ہوش ہو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھولی تو ایک رضائی میرے اوپر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر وہ بندھے ہوئے تھے۔ بہت کوشش کے بعد اپنے سر کو رضائی سے باہر نکالنے میں کامیابی ملی تو ایک امریکی خاتون فوجی کو دیکھا جو کمرے کے دروازے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ قریب آئی اور نرم لہجے میں پوچھا: کیسے ہیں آپ؟ میں نے پہلی دفعہ کسی امریکی کو انسانیت کا مظاہرہ کرتے دیکھا تھا۔ میں جواب نہ دے سکتا تھا۔ خاتون نے پھر پوچھا: انگریزی آتی ہے؟ میں نے ہونٹوں کو حرکت دینا چاہی مگر ایسا کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ شاید خاتون سمجھ گئیں، واپس پلٹیں اور کرسی پر بیٹھ گئیں۔

میرا خیال تھا کہ یہ گوانتاناموبے کا جزیرہ ہوگا مگر کمرے کی دیواروں پر پشتو زبان میں طالبان کی تحریریں دیکھیں، جن کے ساتھ تاریخیں بھی لکھی ہوئی تھیں تو یقین آ گیا کہ یہ گوانتاناموبے نہیں افغانستان کا ہی کوئی علاقہ ہے۔ میں دورانِ قید ایک بھی نماز نہ پڑھ سکا، کھانا نہ پینا، نیند بھی صرف وہی تھی جو بے ہوشی کی حالت میں ہوتی۔ سارا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا اور بدن سے درد کی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ وقت اسی فکر میں گزرتا کہ آگے کیا ہوگا؟ شام کو حالت تھوڑی سنبھلی اور زبان کو حرکت ملنے لگی۔ اس دوران دوسرے فوجی آ گئے۔ جن سے میں نے انتہائی نحیف آواز میں پوچھا: Can you help me? انہوں نے پوچھا کس چیز کی ضرورت ہے؟ میں نے نماز پڑھنے کی اجازت چاہی جو انہوں نے دے دی۔ میں نے بندھے ہاتھوں سے تیمّم کیا اور بیٹھ کر نماز پڑھنا شروع کی۔ اس دوران دو فوجی میرے قریب بیٹھ گئے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے نماز مکمل نہیں پڑھنے دیں گے مگر اللہ نے رحم کیا اور میں نے پوری نماز پڑھ لی۔

سلام پھیرنے کے بعد ایک فوجی 'جو وردی میں تھا' نے ایرانی فارسی میں صحت دریافت کی۔ کھانے کے بارے میں دریافت کیا اور پوچھا سردی تو نہیں لگی؟ ہر سوال پر میرا جواب ''الحمدللہ'' ہوتا۔ شکایت کرتا اور نہ کچھ مانگتا تھا۔ میں شکایت کیوں کرتا۔ میرے حال سے سب واقف تھے اور اگر کوئی واقف نہ تھا تو اس کو میرے جسم اور چہرے پر لگا خون صاف نظر آتا تھا۔ انہوں نے اسامہ بن لادن اور ملا عمر کے بارے میں پوچھنا شروع کیا اور میری طرف سے ہر سوال کا جواب نفی میں پایا تو ان کا رویہ سخت ہو گیا۔ ان کے سخت رویئے نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا۔ میرے یہاں چھے روز مکمل ہو گئے تھے۔ ان چھے دنوں میں' میں نے کھانا نہیں کھایا کیونکہ جو خوراک وہ دیتے تھے' اس بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ حرام ہے یا حلال؟ ٹھیک چھے دن بعد مجھے ایک گلاس چائے کے ساتھ آدھی افغانی روٹی دی گئی جس کے بعد چائے کے ساتھ ایک روٹی روزانہ دی جانے

لگی۔ میں نے پورا ایک مہینہ اسی طرح گزارا۔ پہرے پر مامور فوجیوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ مجھے نیند کے لیے نہ چھوڑا جائے۔ میں بیس دن تک بے خوابی کا شکار رہا، نہ کھانا وقت پر ملتا اور نہ ہاتھ پاؤں کھلے۔ روزانہ وہی دو افراد آتے اور ایک ہی قسم کے سوالات پوچھتے رہتے۔ میں کمرے میں اکیلا ہوتا تھا۔ کوئی نظر آتا تھا اور نہ کسی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ بیس دن بعد مجھے ایک چھوٹے سائز کا قرآن مجید کا نسخہ دیا گیا جس کی وجہ سے میری مصروفیت پیدا ہوگئی۔ شاید ۲۴ یا ۲۵ جنوری ۲۰۰۲ء کا دن تھا۔ صبح نو بجے کے قریب اچانک میرے کمرے میں ایک دوسرے قیدی کو لایا گیا جس کے کچھ وقفے کے بعد چھ مزید قیدیوں کو لایا گیا۔ ان سب کو مضبوط رسیوں سے باندھا گیا تھا اور سب کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئی تھیں۔ ان کے ساتھ عربی بولنے والے تفتیش کار بھی تھے۔ جنہوں نے ان قیدیوں کو آپس میں بات نہ کرنے کا حکم دیا۔ فوجیوں نے دروازے کے سامنے بڑا تختہ رکھا اور دو مسلح فوجیوں کو کمرے کے اندر ہی پہرہ دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی مگر قیدیوں نے تھوڑی دیر بعد باتیں شروع کر دیں۔ میں خاموش رہا۔ ایک عربی تفتیش کار نے آ کر ان کو چپ کرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ ایک عرب بھائی نے مجھ سے پوچھا: آپ ضعیف ہیں؟ میں نے کہا: ہاں وہی ہوں۔ پھر دوسرے بھائیوں نے بھی اپنا تعارف کرایا۔ ان میں سالم قطر، سلمان یمن، شیخ فیض کویت، سمیر الجزائر، طارق الجزائر (جس کے پاس برطانیہ کی شہریت بھی تھی) اور محمد قاسم حلیمی کا تعلق افغانستان سے تھا۔ ان سب کو عصر تک میرے ساتھ ساتھ رکھا گیا۔ شام کو یہ سارے افراد واپس لے جائے گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے ان قیدیوں کے ساتھ جو لمحات گزارے ان سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ رات گزری، صبح ان کو دوبارہ لایا گیا۔ میں نے ان کو خوش آمدید کہا اور خیریت دریافت کی۔ انہوں نے رات دیگر قیدیوں کے ساتھ گزاری تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس ریڈ کراس کے لوگ آئے تھے مگر امریکی نہیں چاہتے کہ ریڈ کراس والے ہم سے ملیں۔ ہم نے عصر تک خوب گپ شپ کی۔ ان دو دنوں کے دوران نسبتاً اچھا کھانا دیا گیا۔ دوسری شام ان کو پھر لے جایا گیا۔ میرے کمرے میں بلا کی سردی تھی۔ دو دن بعد مجھے نچلی منزل لے جایا گیا جہاں محمد قاسم حلیمی اور سالم موجود تھے۔ یہاں ہم نے پھر گپ شپ شروع کی۔ ہم تین دن ساتھ رہے۔ آخری رات ان کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔ رات کو حلیمی صاحب کو بھی تفتیش کے لیے لے جایا گیا۔ میں عشاء کی نماز سے فارغ ہی ہوا تھا کہ فوجی آئے اور کہا آپ کو نیچے لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے نیچے دوسرے مسلمان بھائیوں کو بھی دیکھا جن کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ یہ بیس کے لگ بھگ افراد تھے جن کے چہروں پر کالے سیاہ تھیلے چڑھائے گئے تھے جو منتقل ہونے کی نشانی تھی۔ ہمیں پتا نہ تھا کہ کہاں منتقل کیا جا رہا ہے۔ ہم سب کے ہاتھ پیچھے باندھے گئے اور قطار میں کھڑا کر کے سب کو ایک رسی سے باندھ دیا گیا۔ اس رسی کو امریکی فوجی کبھی ایک جانب کھینچتے، کبھی دوسری جانب۔ جس سے سارے قیدی ایک طرف گر جاتے، ان کو اٹھایا جاتا اور پھر یہی عمل دہرایا جاتا۔ نافع نامی ایک سوڈانی عرب کی دونوں ٹانگیں زخمی تھیں۔ وہ درد کے مارے چیختا تو فوجی اس کو چپ کرانے کے لیے مارنا شروع کر دیتے تھے۔ امین اللہ نامی ہمارا ایک ساتھی چیخ چیخ کر کہتا کہ ہمیں ذبح کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ ہم سب کا اندازہ یہی تھا کہ ہمیں مار دیا جائے گا۔ کوئی بآواز بلند کلمہ شہادت کا ورد کر رہا تھا، کسی نے قرآن مجید کی آیات کی تلاوت شروع کر دی تھی۔ اسی کشمکش میں ایک طرف روانہ کر دیا گیا۔ یہ ویران اور بنجر زمینیں تھیں۔ ہم گرتے پھر اٹھ جاتے۔ ہم نے ایک

بڑے جہاز کی آواز سنی۔ ہمیں رفتہ رفتہ اس جہاز کے قریب لے جایا گیا۔ جہاز کے نزدیک لے جا کر ہمیں دھکے دیئے گئے اور ایک دوسرے کے اوپر گرا دیا گیا پھر ایک ایک کر کے جہاز میں چڑھایا گیا جہاں گردن اور پاؤں کو رسیوں سے باندھ کر ہمیں جہاز میں ایک بنچ سے باندھ دیا گیا۔ ہم میں سے کوئی فریاد کرتا تو اسے مضبوط لات پڑتی۔ یہ غالباً ۸ یا ۹ فروری ۲۰۰۲ء کا دن تھا۔ ایک گھنٹہ بعد جہاز اترا اور تمام قیدیوں کو باری باری اتارا گیا۔ مجھے کھینچتے ہوئے جہاز سے دور لے جایا گیا اور گھونسوں، لاتوں، ٹھوکروں کی بارش کر دی گئی۔ پھر ہم سب کو اکٹھا کیا گیا کبھی ایک ایک کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا، کبھی ایک ایک فوجی کئی کئی قیدیوں کو مارتا، سخت سردی میں مٹی میں بٹھا کر اوپر پانی ڈالا جاتا اور وحشی فوجی دانوں سے کاٹنے لگتے۔ اس سلوک سے بھی وہ مطمئن نہ ہوتے تو لاٹھیوں سے حملہ آور ہو جاتے۔ ہمارے لیے قدرے اطمینان کی بات یہ تھی کہ چونکہ چہرے پر تھیلے چڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے ہمارے چہرے مٹی سے بچے ہوئے تھے۔ اس دوران دو فوجیوں نے بازوؤں سے پکڑ کر مجھے مٹی سے باہر نکالا اور اپنے بھاری بوٹوں سے میری پسلیوں میں ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ مجھے اٹھا کر زمین پر الٹا پٹخ دیا جاتا۔ زمین پر پڑتے ساتھ ہی پانچ فوجی میرے سر، کمر اور ٹانگوں پر چھلانگیں لگانا شروع کر دیتے۔ اس ظلم کے دوران میں سوچتا کہ کہاں گئے وہ انسانی حقوق کے علمبردار؟ میرا ننگا بدن اور اتنا ظلم، مگر میں اللہ سے حوصلہ مانگتا تھا پھر کیمروں کی ٹک ٹک شروع ہو گئی۔ قیدیوں کی تصاویر بنانے کا عمل شروع ہوا۔ فلیش کی لائٹس سے آنکھیں چندھیانے لگیں۔ اس بدترین تشدد کے دوران میرے سر کا تھیلا اترا ہوا تھا۔ میں نے زندگی کا ہولناک منظر دیکھا جب ساری قیدی ننگے تھے، کوئی مٹی میں پڑا تھا، کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ میرا دل پھٹا جاتا تھا۔ امریکی مرد و عورتوں کے لیے یہ دل لبھانے والا تماشا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر ہم بے بس انسانوں کی تصویریں بنا رہے تھے اس انسانیت سوز مظاہرے کے بعد ہمیں ایک بڑے خیمے کے اندر لے جایا گیا، جہاں سوال جواب، فوٹو گرافی اور ڈاکٹر کے ذریعے طبی معائنے کے بعد ہمیں یونیفارم دیا گیا۔ خیمے کی چار دیواری لکڑی کے تختوں سے بنائی گئی تھی جو زمین سے صرف ایک میٹر اونچی تھی۔ خیمہ مستطیل شکل کا تھا اور چاروں طرف خاردار تاریں بھی لگائی گئی تھیں۔ اس قسم کے خیمے چاروں اطراف میں نظر آتے تھے۔ ایک ایک خیمے میں بیس

کمانڈر دوستم کے ہولناک مظالم

تاجکستان کے محمد یوسف اور یمن کے مختار میرے پڑوس میں قید تھے۔ ان کو قلعہ جنگی سے زندہ گرفتار کیا گیا تھا۔ انہوں نے اپنا بپتا سنائی کہ وہ کس طرح گرفتار ہوئے اور دوستم کے وحشی فوجیوں کے مظالم کا شکار بنے۔ وہ کہتے کہ دوستم اور ان کے ساتھی، طالبان مجاہدین کو گولی نہ مارتے بلکہ کھلے میدان میں کھڑا کر کے ننگا کر دیتے، کانوں میں لکڑی کے ٹکڑے ٹھونس دیتے اور پتھر مار مار کر مار دیتے تھے۔ طالبان کو ننگا کر کے میدان میں پھرایا جاتا۔ پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر کنٹینر میں بند کر دیا جاتا اور تالا لگا کر کنٹینر کے نیچے آگ جلا دی جاتی۔ اس طریقے سے دوستم نے پانچ سے آٹھ ہزار تک طالبان کو جان سے مارا۔ محمد یوسف نے بتایا کہ میرے ناخن پلاس کے ذریعے نوچے گئے۔ وہ باقاعدہ پاسپورٹ لے کر افغانستان گیا تھا اور قندوز میں مزدوری کیا کرتا تھا۔ وہ کہتا کہ ایک کنٹینر میں ۳۳۰ طالبان کو ٹھونس ٹھونس کر بند کیا جاتا، کنٹینر کے باہر جو آوازیں سنائی دیتیں تو لگتا کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے کوئی کہتا کہ حضور (ﷺ)! آ رہے ہیں، کوئی کہتا ہم جنت جا رہے ہیں۔ یوسف نے کہا کہ مجھے بھی تین دن تک کنٹینر میں بند رکھا گیا۔ تین دن بعد جب کنٹینر کھولا گیا تو اس میں صرف چند افراد ہی زندہ بچے تھے جن میں سے ایک میں بھی تھا۔

افراد سما سکتے تھے۔ مجھے ایک فوجی نے وہ سامان دکھایا جو غالباً ہر قیدی کو دیا گیا تھا۔ ایک اوڑھنے کی چادر، ایک جوڑا جراب، بوٹ اور کپڑے کی ایک ٹوپی مجھے بھی دے دی گئی۔ مجھے نارنجی شلوار قمیص بھی دی گئی جو میں نے پہن لی۔ ملا محمد صادق بھی اسی خیمے میں لائے گئے جن کا تعلق صوبہ ارزگان سے تھا۔ ان کو چمن سے گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ وہ افغان جہاد کے دنوں میں صدقیہ تنظیم کے پلیٹ فارم سے ہمارے امیر رہے تھے۔ سخت سردی تھی۔ میں نے ان کو لباس پہننے میں مدد دی۔ آس پاس کے خیموں میں قیدی ایسے لگتے تھے جیسے سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر گئے ہوں۔ ملا اخوند مجھ سے بار بار پوچھتے کہ کتنے لاشے پڑے ہوئے ہیں؟ میں کہتا کہ یہ مرے نہیں' سو رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہر خیمے سے اذان کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے ہم کسی شہر میں ہوں۔ ملا اخوند نے الحمدللہ کہا، سجدے میں گر گئے اور کہا: ضعیف بھائی! مجھے تو لگتا ہے کہ ہم اسلام کے قلعے میں آ گئے ہیں۔''

اذانوں کی آوزیں اتنی مسحور کن تھیں کہ سردی، درد، بھوک اور پیاس سمیت ساری تکلیفیں بھول گئے۔ میں سوچتا تھا کہ یہ مار پیٹ، بدن کا ننگا ہونا، ہفتہ ہفتہ بھر بھوکا پیاسا رہنا نجانے خدا کیوں ناراض ہے اور ہم نے مزید کن امتحانوں سے گزرنا ہے۔

قندھار میں تفتیش کا مرحلہ:

صبح ہوئی، ہم نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد آرام کرنا چاہا مگر اجازت نہ دی گئی۔ مجھے چھوڑ کر عرب بھائیوں کو تفتیش کے لیے لے جایا گیا۔ لے جاتے وقت بہت مشکل لمحہ ہوتا، فوجی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لے کر آتے اور چیخ چیخ کر کہتے کہ نکلو، پھر ہاتھ پیچھے باندھ کر بندوقیں تان لیتے اور دوزانو کھڑا کر کے پھرنے پر مجبور کرتے۔ قیدیوں کو مٹی کے گارے میں پھینکتے پھر اٹھاتے۔ اس کے بعد سر اور چہرے پر تھیلا چڑھا کر باہر نکالتے اور خیمے کا دروازہ بند کر دیتے۔ آرام ہمیں نہ دن کو تھا، نہ رات کو۔ تفتیش کے مراحل دونوں اوقات میں ہوتے تھے۔ تفتیش کے لیے لے جاتے وقت قیدیوں کے سر زمین سے رگڑے جاتے۔ ان کو گھٹنوں کے بل چلنے کو کہا جاتا۔ پیچھے کتے لگا دیئے جاتے تا کہ قیدی تیز تیز چلیں۔ اس دوران ایک بے حیا، نیم برہنہ امریکی عورت اپنی تیز اور کانوں میں سیسہ گھولتی آواز سے تیز چلنے کو کہتی۔ میں جب گھٹنوں کے بل جاتا تو میرے گھٹنوں کا گوشت ادھڑ جاتا اور شلوار پھٹ جاتی تھی۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا جاتا۔ اس دوران آنکھیں بندھی ہوتیں۔ میں اور میرے دوسرے ساتھی بے رحم امریکی فوجیوں کے رحم و کرم پر ہوتے۔ اگلی صبح ریڈ کراس کے کچھ لوگ آئے جو ہماری حالت زار سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں کاغذ دیئے کہ اپنے گھروں کو خط لکھیں۔ ریڈ کراس کے اہلکار خاردار تار کے اس پار کھڑے ہو کر ہماری طبیعت پوچھتے۔ ہمارا شک تھا کہ یہ کسی امریکی خفیہ ادارے کے لوگ ہوں گے۔ اس لیے ہم احتیاط سے بات کیا کرتے اور ان کو دل کا حال نہ بتا سکتے تھے۔ ریڈ کراس کا خطوط کے تبادلے میں جو کردار تھا' وہ قابل ستائش ہے۔ ریڈ کراس والے روٹی، چائے اور کتابوں کی دستیابی کے حوالے سے پوچھتے۔ ہم کہتے کہ مناسب مقدار اور تعداد میں یہ چیزیں نہیں مل رہیں۔ احترام انسانیت، مذہبی کتابوں کے تقدس کا خیال رکھنے اور مناسب مقدار میں پانی دینے کے ہمارے مطالبات کبھی بھی پورے نہیں ہوئے۔

۱۰ر فروری ۲۰۰۲ء سے جولائی کے آغاز تک مجھے قندھار میں رکھا گیا۔ اس دوران چہرہ دھویا سکا نہ ہاتھ۔ صرف پینے کے لیے تھوڑا سا پانی ملتا تھا۔ چوری چھپے منہ ہاتھ دھونے پر سخت سزا دی جاتی اور اسی خوف سے کوئی ہاتھ پیر اور منہ دھونے کی کوشش نہ کرتا۔ ایک مرتبہ سات سات افراد کو باندھ کر خیمے سے چند قدم دور لے جایا گیا جہاں باری باری سب کے کپڑے

اتارے گئے۔ ہر قیدی اپنے مخصوص اعضاء تک چھپانے سے قاصر تھا۔ سب کو ایک ایک لوٹا پانی دے کر خود کو دھونے کا حکم سنایا گیا۔ امریکی مرد و عورتیں ارد گرد کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے۔ یہ بہت توہین آمیز بات تھی کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے خود کو دھوئیں۔ میں ساتھیوں کو آواز دیتا کہ ہم مجبور ہیں، آنکھیں بند کر کے نہائیں۔ یہ میرے لیے انتہائی افسوسناک بات تھی کہ قندھار کی سرزمین پر ہمیں منہ ہاتھ دھونے کی اجازت دی گئی اور نہ غسل کرنے کی۔

اگلے دن مجھے تفتیش کے لیے لے جایا گیا۔ قندھار میں مجھ سے تفتیش کا یہ دوسرا مرحلہ تھا۔ ایک ٹینٹ میں لے جا کر ہاتھ باندھے گئے اور بائیوگرافی لکھی گئی۔ اس کے بعد نسبتاً نرم لہجے میں سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ سوال پوچھنے والوں کی ملا عمر اور اسامہ بن لادن سے دلچسپی زیادہ تھی۔ میرے جوابات اکثر نفی میں ہوتے۔ تین مختلف قسم کے کاغذات، سرخ، زرد اور سفید پر لکھے جاتے۔ دو گھنٹے پر محیط اس تفتیش کے بعد تھیلا سر اور چہرے پر چڑھا کر مجھے واپس لایا گیا۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ مجھے لے جایا جاتا اور واپس لایا جاتا۔ سوالات بھی روزانہ ایک ہی قسم کے ہوتے اور میرے جوابات بھی۔ قندھار میں دورانِ قید شرائط زیادہ سخت نہ تھیں۔ ہر خیمہ میں بیس قیدیوں کو رکھا جاتا جن میں تین افراد کو اکٹھا بیٹھنے کی اجازت تھی۔ تین سے زیادہ بیٹھتے اور باتیں کرتے تو سخت سزا دی جاتی تھی۔ ہم نماز باجماعت پڑھ سکتے تھے۔ سردی کا موسم تھا۔ دھوپ میں بھی بیٹھنے کی اجازت تھی مگر جس چیز کا نام انسانی عفت ہے' وہ یہاں عنقا تھی۔

رات کو سونے کے دوران کتوں کے بھونکنے سے سارے قیدی جاگ جاتے۔ اس وقت تک قیدیوں کی تعداد چھے سات سو تک پہنچ چکی تھی۔ فوجی اپنے کتوں کے ہمراہ آتے، ایک ایک قیدی کو الٹا لٹا کر اس کی تلاشی لیتے، کتے قیدیوں کے بدن سونگھتے۔ یہ سلسلہ ساری رات چلتا رہتا۔ قیدیوں کو زائد المیعاد ڈبہ بند خوراک دی جاتی تھی جس میں کبھی کبھار خنزیر کا گوشت بھی ہوتا تھا جو بہت سے بھائی لاعلمی میں کھا لیا کرتے تھے۔ وہ ڈبوں کا لکھا نہیں جانتے تھے بالخصوص انگریزی زبان سے بالکل ناواقف تھے۔ اکثر اوقات خوراک سے بدبو آتی مگر یہ جاننے کے باوجود کہ یہ خوراک صرف صحت کے لیے نقصان دہ ہے، ہم مجبوری کے تحت کھا لیتے تھے کیونکہ ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ جون میں ہماری خوراک میں تبدیلی لائی گئی۔ اب کی بار خوراک کی کیفیت بھی اچھی تھی اور ساتھ کچھ میوہ اور میٹھا بھی دیا جانے لگا۔ خوراک کے ڈبوں پر ''حلال'' اور "Kosher" لکھا ہوتا۔ خوراک کے ساتھ ایک افغانی روٹی بھی دی جانے لگی۔ روٹی کی تقسیم کا طریقہ کار یہ تھا کہ خیمے کے سامنے ڈبوں کا کارٹن رکھا جاتا۔ ایک ایک بوتل پانی بھی دیا جاتا۔ آدھے گھنٹے میں کھانا کھا کر ڈبے واپس کرنے کی پابندی تھی۔ کوئی یہ پابندی توڑتا تو اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ تیونس کے عادل اور الجزائر کے سمیر بڑے ''اداکار'' تھے۔ کسی طریقے سے دو دو ڈبے ہتھیا کر چھپ چھپ کر کھاتے۔ بیس افراد کے لیے ٹائلٹ پیپر کا ایک رول روزانہ دیا جاتا۔ ایک باریک کپڑے کی چادر لگا کر بیت الخلاء بنا گیا تھا۔ رفع حاجت کے وقت ہم فوجیوں کو اور فوجی ہمیں نظر آتے۔ دن میں تین مرتبہ طبی عملہ آتا جس میں اکثریت عورتوں کی تھی اور وہ مکمل ڈاکٹر معلوم نہ ہوتے تھے۔ ہر مرض کی دوا پانی کو قرار دیتے تھے۔ قبض، بخار اور زکام عام بیماریاں تھیں۔ قیدیوں کے خیمے ائرپورٹ کے نزدیک ایسی جگہ لگائے گئے تھے جہاں ہر وقت طیاروں کا شور ہوتا اور گرد و غبار کے مرغولے اٹھتے۔ کپڑے اور خوراک ہر وقت مٹی سے اٹی رہتی تھی۔ طیاروں کے گزرنے کی وجہ سے خیمے اوپر اٹھ

جاتے۔قیدی اس وجہ سے رات کو نیند پوری نہ لے سکتے تھے۔امریکی فوجی قیدیوں کو تشدد کا نشانہ بناتے وقت ایسی غلیظ گالیاں دیتے جو انگریزی نہ جاننے کے باوجود سب کو سمجھ آتی تھیں۔فوجی جس قیدی کو سویا ہوا پاتے تو اس کے سر پر چھوٹی کنکری یا ڈھیلا مارتے اور اس کی نیند خراب کر دیتے تھے۔دن رات میں تین دفعہ قیدیوں کی گنتی کی جاتی اور سب کو قطار میں کھڑا کر کے باقاعدہ ''حاضری'' لی جاتی تھی۔میرا نمبر 306 تھا۔یہاں مجھے دو بہت دلچسپ قصے یاد آ گئے۔

گنتی کرنے والوں کی اپنی شرائط تھیں۔ہر بار نیا فوجی گنتی کرنے آتا۔ایک مرتبہ ایک فوجی آیا اور ترجمان کی مدد سے حکم سنایا کہ جب میں نظر آؤں تو تمام قیدی کھڑے ہو جائیں اور قطار بنا کر سر جھکائیں۔جس قیدی کا نمبر پکاروں' وہ پیچھے ہٹ کر بیٹھ جائے۔حیرانی اس بات پر نہ تھی کہ ایک کم درجے کا فوجی یوں غرور کا مظاہرہ کر رکھا تھا بلکہ افسوس اس بات کا تھا کہ اس امریکی کو جیسے ملک میں کوئی دوسرا دھندہ ہاتھ نہ آیا تو جو میں بھرتی ہو گیا اور یہاں آ کر مسلمانوں سے اپنی نفرت کا یوں متکبرانہ انداز میں اظہار کر رہا تھا۔ایک کالا کلوٹا بندر کی شکل کا فوجی جو انتہائی سخت گیر تھا،گنتی سے پہلے تمام قیدیوں کو کھڑا کرتا اور گنتی کا عمل دو دو تین تین گھنٹے تک جاری رکھتا۔یہ یہاں زندگی گزارنے کے لیے آیا تھا۔شیر سے لے کر ٹڈی دل تک کے حقوق کا اس ملک پر چارک تھا مگر ہم مسلمانوں کے لیے جائے پناہ نہیں تھی۔ایک دن ہمارے خیمے کے خاردار تار چیک کر رہا تھا کہ اس کو زمین پر شیشے کا ایک ٹکڑا ملا۔میرے پاس آ کر پوچھا: یہ شیشے کا ٹکڑا کون لایا ہے؟ میں نے لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ نہ سامان میرا اپنا ہے اور نہ خود آیا ہوں۔اس نے اصرار کیا کہ مجھے بتاؤ مگر چونکہ واقعی مجھے علم نہیں تھا' اس لیے میرے جواب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔وہ چیخ چیخ کر غلیظ گالیاں بکنے لگا۔اس نے مجھے دوزانو کھڑا کیا اور صلیب کی طرح ہاتھ پھیلانے کا حکم سنایا۔اسی طرح کئی گھنٹے گزر گئے۔وہ مجھے دیکھتا تو گالیاں سناتا۔میں پوچھتا کہ گالیاں کیوں دیتے ہو؟ تو مزید گالیاں دینا شروع کر دیتا۔فوجیوں کو جواب دینا جرم تھا۔ان کے لیے کوئی قانون نہ تھا۔غلاموں کی یہ بادشاہی یاد آتی ہے تو دل بہت جلتا ہے۔ہم دلیر جوان، جو اِن بزدل لوگوں کے چنگل میں تھے، کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ہمارے پڑوس میں ایک دوسرا قید خانہ تھا' جہاں کے قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا تھا۔ان کے جسم کپڑوں سے بے نیاز تھے اور ان پر کتے بھی چھوڑے جاتے تھے۔ایک دن ہمارے قید خانے میں ایک سفید ریشے بوڑھے کو لایا گیا جو اپنے حواس کھو چکا تھا،انتہائی سہما ہوا تھا،فوجیوں اور قیدیوں میں تمیز نہ کر سکتا تھا،کمزوری کی وجہ سے نہ اٹھ سکتا تھا،نہ بول سکتا تھا۔فوجیوں نے اس پر چڑھ کر اس کو باندھنا شروع کیا تو وہ زور زور سے چیخنے لگا کہ دو رکعت نفل تو پڑھنے دو پھر ذبح کر لو۔ہم نے سمجھایا کہ بابا آپ کو ذبح کرنے نہیں' تفتیش کرنے لے جایا جا رہا ہے مگر وہ ہماری نہ سنتا تھا۔یہ پہلا قیدی تھا جس کو بعد میں گوانتاناموبے سے رہا کیا گیا۔اس کی عمر ۱۰۵ سال تھی اور تعلق صوبہ ارزگان سے تھا۔

ایک رات کھانا کھایا،نماز سے فارغ ہونے کے بعد سونے ہی لگے تھے کہ اچانک بہت ساری تعداد میں فوجی اندر آئے۔باہر ہیلی کاپٹر کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔فوجیوں نے آتے ساتھ ہی ہلہ گلہ مچا دیا۔ایک ایک قیدی کو باہر پھینکتے اور الٹا لٹا کر تلاشی لیتے۔اس منظر کی ویڈیو فلم بھی بنائی گئی تا کہ وہ امریکیوں کو دکھا سکیں کہ ہم نے دہشت گردوں (ان کے بقول) کو کس طرح قابو میں رکھا ہوا ہے۔ایک مرتبہ آدھی رات کو لگ بھگ ایک بجے کے قریب دو فوجیوں کے ذریعے مجھے بندھی آنکھوں اور بندھے ہاتھوں تفتیش والے کمرے لے جایا گیا جہاں میری خوب خاطر مدارت کی گئی، مجھے کرسی پر بٹھایا گیا، سامنے میز پر چائے اور کچھ مٹھائی پڑی تھی، بعد میں دو اور فوجی بھی آ گئے جن کا رویہ غیر متوقع طور پر شائستہ تھا۔میں حیران تھا

کہ آج یہ کیسے انسان کے بچے بن گئے ہیں۔انہوں نے میرا ہاتھ کھولا اور پھر انتہائی نرم لہجے میں میری طبیعت پوچھی۔گھر کے بارے میں پوچھا اور بتایا کہ ہمیں آپ کے خلاف کوئی شہادت نہیں ملی۔انہوں نے پیسے کی لالچ دی اور اس شرط پر رہائی کی پیشکش کی کہ آپ ملاعمر اور اسامہ بن لادن کی گرفتاری میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔معلوم نہیں اس وقت مجھ میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی کہ میں نے انتہائی پراعتماد لہجے میں کہا کہ مشروط رہائی سے میری گرفتاری بہتر ہے۔میں نے اپنی گرفتاری کی وجہ پوچھی تو ایک فوجی نے بتایا کہ ہمیں شک تھا کہ آپ القاعدہ اور نائن الیون کے واقعے کے بارے میں جانتے ہوں گے مگر ہمیں اس حوالے سے آپ کے ذریعے کوئی معلومات نہیں ملیں (ان کی نظر میں' میں ماڈریٹ تھا)۔میں نے ان سے کہا کہ آپ کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔میں نے ان کی شرائط پر رہا ہونے سے صاف انکار کیا تو ان کا رویہ سخت ہو گیا اور نامراد واپس لوٹنا پڑا۔وہ لگاتار تین دن تک آتے رہے اور مجھے اپنے فیصلے پر نظرثانی کا کہتے رہے مگر میرا جواب ایک ہی تھا۔

ایک دن مجھے تفتیش کے لیے لے جایا گیا تو ایک تفتیش کار نے پوچھا کہ آپ متوکل صاحب (طالبان دور کے وزیرخارجہ) کو جانتے ہیں؟ان کا احترام کرتے ہیں؟اور کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان سے آپ کی ملاقات ہو؟میں نے اثبات میں جواب دیا۔مجھے شک ہوا کہ وکیل احمد متوکل صاحب بھی پکڑے گئے ہیں۔میں نے پوچھا: متوکل صاحب کہاں ہیں اور ان سے کیسے ملاقات ہو سکتی ہے؟تفتیش کار نے بتایا کہ وہ ہماری تحویل میں ہیں،آپ چاہیں تو لے آئیں؟میں نے کہا ضرور۔میں ان سے اس لیے بھی ملنا چاہتا تھا کہ معلومات لے سکوں اور ان سے طالبان بھائیوں کی حالت زار بارے پوچھ سکوں مگر مجھے اس امر کا پتا نہیں تھا کہ ہماری ملاقات سے امریکی فوج کا مقصد کیا تھا؟ کچھ دیر بعد متوکل صاحب کو لایا گیا۔ان کے ہاتھ میں ایرانی بسکٹ بھی تھے جو وہ بطور تحفہ میرے لیے لائے تھے۔علیک سلیک کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔اس لیے بسکٹ کھانا ممکن نہ تھا۔میں ان کا تحفہ قبول کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا مگر یہ بسکٹ میں اپنے ساتھ بھی نہ لے جا سکتا تھا۔

دس منٹ گفتگو کے بعد متوکل صاحب رخصت ہوئے اور مجھ واپس لے جایا گیا۔اس ملاقات سے مجھے اندازہ ہوا کہ بہت جلد گوانتاناموبے لے جایا جاؤں گا۔گو کہ متوکل صاحب نے ایسی کوئی واضح بات نہیں کہی تھی مگر میرا گمان یہی تھا۔اس کے دوسرے دن مجھے پھر تفتیش والے کمرے لے جایا گیا۔یہ قندھار میں میری تفتیش کا آخری مرحلہ تھا۔تفتیش کار نے مجھے بتایا کہ یکم جولائی کو گوانتاناموبے کے لیے آپ کی پرواز ہوگی۔ہم ان قیدیوں کو گوانتاناموبے بھیجتے ہیں جو مرتے دم تک وہاں رہیں گے اور موت کے بعد بھی یہ گارنٹی نہیں کہ ان کی میت وطن واپس لائی جائے گی یا نہیں؟اب یہ آپ کے پاس آخری موقع ہے بتائیں گھر جانا ہے یا گوانتاناموبے؟ گھر واپسی کے لیے اس تفتیش کار نے اپنی پرانی شرائط دہرائیں۔بالفاظ دیگر مجھے کہا کہ آپ کو رہائی کے بدلے امریکی جاسوس بننا ہوگا۔اللہ مجھے اس کام سے بچائے۔تفیش کار نے سوچنے کے لیے پھر ایک دن کی مہلت دی اور کہا کہ خوب سوچ سمجھ کر کل جواب دے دو۔میں نے بغیر کسی تامل کے جواب دیا کہ کل بلانے کی ضرورت نہیں۔میں نے سوچ لیا ہے کہ میں کسی قسم کی مصلحت سے کام نہیں لوں گا کیونکہ میں خود کو قصوروار نہیں سمجھتا۔آپ کی مرضی جہاں لے جانا چاہتے ہیں لے جائیں۔میرا جواب سننے کے بعد مجھے واپس خیمے لایا گیا۔میں اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ کب مجھے گوانتاناموبے روانہ کیا جائے گا۔اس کے اگلے دن میری داڑھی،سر کے بال اور مونچھیں پھر مونڈ دی گئیں۔

جاری ہے